درجاتِ معیشت اور اسلام

ممتاز احمد سالک اسسٹنٹ پروفیسر
ادارہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

ایک اہم اساسی تصور جو اسلام کے معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے، وہ ہے درجات معیشت میں فطری تفاوت، اسلام کیونکہ ایک حقیقت پسند اور عملی دین ہے اس لیے وہ حقائق کا اپنے زاویۂ نگاہ اور مزاج و مقاصد کے مطابق شعور دلاتا ہے جن پر معاشی زندگی کی تعمیر و سرگرمی کا دارو مدار ہوتا ہے۔ وہ کوئی ایسا نعرہ نہیں لگاتا جو عقل، فطرت اور انصاف کے خلاف ہو، اسلیے وہ اس بات کا قائل نہیں ہے کہ نکمے اور محنتی، سست و چست، کمزور و توانا، قابل و نالائق، ماہر و بے ہنر اور تجربہ کار و اناڑی، معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور تماشہ دیکھنے والے، کاروباری خطرہ و نقصان کے امکان کا مقابلہ کرنے والے اور اس سے دامن بچانے والے سارے لوگوں کو ایک معاشی سطح پر رکھا جائے اور انہیں مساوی معاوضہ و نفع کا حقدار سمجھا جائے، اس کے برعکس وہ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ انسانوں کی چونکہ ذہنی صلاحیتیں اور استعدادیں بھی مختلف ہیں اور جسمانی توانائیاں اور قوتیں بھی، ان کے مزاج و طبائع میں بھی فرق ہے اور جذبات و احساسات میں بھی، ان کے اغراض و مقاصد بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور انہیں حاصل کرنے کے انداز و طریقے بھی، اسلیے ان کے اثرات و نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ [1]

---

[1] سورۃ الیل، ۹۲/۶

"درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں"

اس لیے حق وانصاف کا یہ تقاضہ ہے کہ لوگوں کی آمدنی، منافع اور اجرتوں میں کاموں کی نوعیت اور کیفیت وکمیت کے اعتبار سے فرق ہو۔ یہی اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشا بھی ہے۔ یہ ایک تکوینی حق ہے جو اسے حاصل ہے وہ پورے نظام کائنات کو چلاتا ہے اور بندوں کے احوال کو بھی بخوبی جانتا ہے اس لیے اپنی حکمت وارادے سے رزق کی کمی وبیشی کے فیصلے صادر فرماتا ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا [1]

ترجمہ: "بے شک تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کردیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے یقیناً وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔"

درجات معیشت میں اس فطری عدم مساوات کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کی نیرنگی وگوناگونی قائم ہے لوگ مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں ترقی ورفعت کی لگن زندہ رہتی ہے، مختلف شعبے اور ادارے معرض وجود میں آتے ہیں، قواعد وضوابط مقرر ہوتے ہیں، حقوق واختیارات کی کمی وبیشی کے دائرے متعین ہوتے ہیں لوگوں کو ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے کیونکہ ہر آدمی کی معاش آزادی ومفادات کے تحفظ کا انحصار دوسروں کی آزادی ومفادات کے احترام پر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک منظم معاشی نظام تشکیل پاتا ہے اور خواہشات کی کثرت اور وسائل کی قلت کی بنا پر انسانوں کو ترجیحات قائم کرنی پڑتی ہیں، اپنی بہت سی غیر ضروری آرزوؤں کو کنٹرول کرنا پڑتا ہے، اپنی آمدنی کو عیش وعشرت، اسراف لغویات اور نقصان دہ امور پر لٹانے سے بچانا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کے ٹوٹنے پھوٹنے سے اپنے رب کو پہچان لیتے ہیں۔ بہت سے لوگ وسائل کی کمی کی وجہ سے شر وفساد اور گمراہیوں اور بدکاریوں سے بچ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ خالق کی نافرمانی اور مخلوق سے ظلم اور مخلوق سے ظلم وزیادتی کرنے سے باز رہتے ہیں۔

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل، ۱۷/۳۰

حدیث قدسی میں ہے کہ!

"میرے بندے ایسے بھی ہیں جن کی صلاحیت مالداری میں ہے، اگر میں انہیں فقیر بنادوں تو وہ دینداری سے بھی جاتے رہیں گے اور بعض میرے بندے ایسے بھی ہیں کہ ان کے لائق فقیری ہی ہے، اگر وہ مال حاصل کرلیں اور تونگر بن جائیں تو اس حالت میں گویا ان کا دین بھی فاسد کردوں"[1]

یہ وہ بہت بڑی حکمت ہے جس کی وجہ سے خالق و رازق کائنات نے تمام انسانوں کو کھلا اور وافر رزق نہیں دیا، وہ اپنے بندوں کے مزاج و طبائع اور خوبیوں، خامیوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ[2]

ترجمہ:۔ "اگر اللہ اپنے بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور وہ ان پر نگاہ رکھتا ہے"

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تشریح میں بجا طور پر لکھا ہے:

"اگر دنیا کے ہر فرد پر ہر قسم کے رزق اور ہر قسم کی نعمت کی فراوانی کردی جاتی تو انسانوں کا ایک دوسرے کے خلاف بغی و فساد حد سے بڑھ جاتا۔ اس لیے کہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے نہ کوئی کسی کا محتاج ہوتا اور نہ ہی کوئی کسی سے دبتا، دوسری طرف دولت مندی کی ایک خاصیت یہ ہے کہ جتنی دولت بڑھتی ہے اتنا ہی حرص و ہوس میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک دوسرے کی املاک پر قبضہ جمانے کے لیے زور و زبردستی کا استعمال عام ہوجاتا، لڑائی، جھگڑے، سرکشی اور دوسری بداعمالیاں حد سے

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۴/۱۱۵

[2] شوریٰ: ۴۲/۲۷

زیادہ بڑھ جاتیں اسلیئے اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو ہر قسم کا رزق اور ہر قسم کی نعمت دینے کی بجائے ان نعمتوں کو اپنے بندوں پر اس طرح تقسیم کیا ہے کہ کسی کے پاس مال و دولت زیادہ ہے، کوئی صحت و قوت میں دوسرے سے بڑھا ہوا ہے، کوئی حسن و جمال سے مالا مال ہے، کسی کے پاس علم و حکمت کی دولت دوسروں سے زیادہ ہے۔ غرض ہر شخص کسی نہ کسی چیز کے لیے دوسروں کا محتاج ہے اور اسی باہمی احتیاج پر تمدن کی عمارت قائم ہے۔[1]

درجات معیشت میں تفاوت کی دوسری بڑی حکمت یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے کام آسکیں اور ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ وہ اس قدر آزاد اور خود مختار نہ ہو جائیں کہ ایک معاشرہ اور منظم اجتماعیت ہی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ انسان ایک معاشرت پسند مخلوق ہے۔ وہ اپنے قیام و بقا، اور تعمیر و ترقی کے لیے اجتماعی زندگی کا محتاج ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک اپنی خواہشات کی تسکین اور ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسروں کا تعاون لینے اور ان سے تعاون کرنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے اظہار، اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے استعمال اور اپنی ترقی و خوشحالی کے حصول کے لیے معاشرتی زندگی کا ضرورتمند ہے۔ وہ معاشی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ اسی صورت میں لے سکتا ہے جبکہ اس کے لیے مواقع کھلے ہوں، کامیابی و ترقی کے امکانات اور مقابلہ و مسابقت کے آزادانہ ذرائع میسر ہوں۔ زیادہ کوشش و کاوش سے اسے زیادہ منافع و صلہ ملے۔ اور درجات معیشت میں بلندیوں تک پہنچ سکے۔ اور پھر معاشی جد و جہد کا سلسلہ حقوق مراتب پر استوار ہوتا ہے۔ کسی بھی کاروباری ادارے کو لیں، اس سے وابستہ لوگوں کے کام کی نوعیت اور فرائض و ذمہ داریوں کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک شخص تو وہ ہوتا ہے جو منتظم اعلیٰ ہوتا ہے جو سارے ادارے کے تمام معاملات کا نگران اور اس کے نفع و نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامی ادارے کی کامیابی و ناکامی ہوتی ہے، دوسری سطح فنی ماہرین، منتظمین و معاونین کی ہوتی ہے جو مختلف ذیلی شعبہ جات کی قیادت کرتے ہیں۔ ایک اور سطح رابطہ رکھنے، ریکارڈ محفوظ کرنے، اشیاء فراہم کرنے اور ارسال کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ ایک اور سطح تکنیکی صلاحیت رکھنے والوں اور جسمانی محنت کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ چپڑاسی، چوکیدار اور مالیوں تک بات پہنچ جاتی

---

[1] معارف القرآن ۷/۶۹۸

ہے۔ یہ ساری سطحیں تقسیم کار کے لیے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ ان کی حکمت یہی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور منظم و مربوط انداز میں اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکیں۔ ان کی اجرتوں کا فرق کام کی کیفیت و نوعیت اور ذمہ داریوں کے مطابق ناگزیر ہوتا ہے تاکہ انہیں پورا پورا صلہ مل سکے اور اپنی محنت، صلاحیت، مہارت اور تجربے میں اضافہ کر کے مزید آگے بڑھنے کا جذبہ بھی حاصل کر سکیں، ہر قسم کی معاشی سرگرمیوں میں یہ جذبہ قوت متحرکہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس پورے معاشرے میں درجات معیشت میں فطری تفاوت کی بنا پر لوگ ایک دوسرے سے کام لینے اور ایک دوسرے کا کام کرنے اور باہمی معاونت و مدد پر مجبور ہیں۔ کوئی فرد یا ادارہ اپنی تمام حاجات ضروریات خود پوری نہیں کر سکتا، معاشرے کے مختلف افراد اور ادارے مل کر اپنی صلاحیت، ذوق، مفادات اور مواقع کے مطابق انہیں پورا کرتے ہیں اسی لیے مختلف پیشے معرض وجود میں آتے ہیں نئے نئے کاروبار شعبے میدان عمل میں اترتے ہیں، نئی سرگرمیاں، تعلقات اور روابط پیدا ہوتے ہیں اور معیشت کی گاڑی رواں دواں رہتی ہے۔ یہ تعلقات و روابط جب ایک خاص شکل میں ڈھلتے ہیں تو "معاشی نظام" جنم لیتا ہے۔ یہی سلسلہ جب بین الاقوامی سطح تک وسیع ہوتا ہے تو "عالمی اقتصادی نظام" نمودار ہوتا ہے۔ اس طرح پوری دنیا ایک دوسرے کی محتاج اور ایک دوسرے کی معاون بن جاتی ہے یہ سب کچھ رب کائنات کی عظیم حکمت کا نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا[1]

ترجمہ: "ہم نے دنیا کی زندگی میں وسائل رزق ان میں تقسیم کر دیئے ہیں اور کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں"

تیسری حکمت جو درجات معیشت کے غیر مساوی ہونے کے بارے میں قرآن حکیم میں بیان کی گئی ہے وہ "آزمائش" ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو وسائل دے کر آزماتا ہے اور کسی سے لے کر، کسی کو فقر، افلاس مصائب اور معاشی تنگیوں میں مبتلا کر کے یہ دیکھتا ہے کہ کسی حد تک صبر کرتا ہے۔ اور کسی کو مال و اسباب کی

---

[1] سورۃ الزخرف ۴۳: ۳۲

کسی سرزمین پر ایک حد کے نفاذ کی برکت وہاں چالیس روز نازل ہونے والی بارش کی برکت سے بہتر ہے

بہتات، عیش وعشرت کے سامان اور فراخی وامارت دے کر یہ دیکھتا ہے کہ اس نے کہاں تک اپنے رب کو پہچانا اور اس کا شکر ادا کیا۔ صبر وشکر محض زبان سے ادا کیے ہوئے الفاظ کا نام نہیں بلکہ رویے اور طرزِ عمل کا نام ہے کہ دونوں صورتوں میں انسان اللہ کو فراموش نہ کرے اور اس کی بتائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرے بلکہ ہر حالت میں اسی کی فرمان برداری واطاعت کا عملی ثبوت پیش کرے اور گمراہی وفساد کی راہوں پر گامزن نہ ہو وہ انہی رویوں کی بنا پر سزا بھی دیتا ہے اور مغفرت بھی کرتا ہے۔ یہ انسان کی اپنی غرض ہے کہ وہ اپنے لیے کیا پسند کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۡ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [1]

ترجمہ :۔ "وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔"

امام طبریؒ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جو فضل اس نے تم پر کیا ہے اور جو رزق تمہیں عطا فرمایا ہے اس بارے میں تمہارا امتحان کرکے اطاعت گذار و نافرمان کو جان لے، اور یہ دیکھے کہ جس امر کا حکم اس نے دیا ہے یا منع فرمایا ہے تو کون اس کا حق ادا کرنے والا اور کون اس میں کوتاہی برتنے والا ہے؟ [2] مولانا مودودیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ اس میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں :۔

ایک یہ کہ تمام انسان زمین میں خدا کے خلیفہ ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں سے بہت سی چیزیں ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرف کے اختیارات بخشے ہیں۔

---

[1] سورۃ الانعام : ۱۶۵/۶

[2] تفسیر طبری : ۲۸۹/۱۲

فضل العالم علی العابد کفضل القمر علی سائر الکواکب (سنن ابوداود وترمذی)

دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی خدا ہی نے رکھا ہے، کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے اور کسی کا محدود، کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرف کے اختیارات دیئے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر، کسی کو زیادہ قوتِ کارکردگی دی ہے اور کسی کو کم اور بعض انسان بھی بعض انسانوں کی امانت ہیں۔

تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے، پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے، اور جس کو جو کچھ بھی میسر ہے خدا نے دیا ہے اور اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرف کیا، کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا، اور کس حد تک اپنی قابلیت یا ناقابلیت کا ثبوت دیا، اسی امتحان کے نتیجہ پر زندگی کے دوسرے مرحلے میں انسان کے درجے کا تعین منحصر ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ فقر و تونگری کے ذریعے صرف عام لوگوں ہی کو نہیں آزماتا بلکہ اس نے انبیاء تک کو آزمایا ہے ایک نبی کی حیثیت سے حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دو مختلف طریقوں پر ان کے ایمان، عقیدے اور اصولوں پر کاربند رہنے کی آزمائش کی حضرت سلیمانؑ کو صرف انسانوں پر ہی نہیں بلکہ جنوں اور پرندوں کے لشکروں تک حکمرانی دے دی۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ[2]

ترجمہ: "سلیمان کے لیے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے"

ان سارے وسائل و اختیارات کے باوجود ان میں نہ تو تکبر پیدا ہوا اور نہ ہی سرکشی، نہ انہوں نے کبھی اپنے رب کی نافرمانی کی اور نہ ہی اپنی شاہی و سلطنت کے گھمنڈ میں لوگوں پر ظلم و استبداد کیا اور ان کے حقوق مارے۔ بلکہ اپنے قول و عمل سے شکر کا مظاہرہ کیا جو کہ صبر سے زیادہ مشکل و کٹھن ہوتا ہے کیونکہ مجبوری و بے چارگی میں تو آدمی صبر کر ہی لیتا ہے لیکن شکر خالصتاً آزاد مرضی و ارادے سے ہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سارے وسائل و اختیارات ان کے لیے آزمائش ہیں چنانچہ پلک جھپکنے کی دیر کے اندر ان کے سامنے ملکہ سبا کا تخت حاضر کر دیا گیا تو پکار اٹھے۔

---

[1] تفہیم القرآن ۱، ۶۰۶/۱

[2] سورۃ النمل ۱۷/۲۷

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي ءَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ط وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيْمٌ [1]

ترجمہ: "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب غنی اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے"

اس کے برعکس حضرت ایوب علیہ السلام کے مال، جائیداد، اہل خانہ، اولاد اور ہر چیز کو چھین لیا گیا یہاں تک کہ ان کے اپنے جسم میں کیڑے پڑ گئے اور اس آزمائش میں چند دن نہیں بلکہ تقریباً اٹھارہ سال تک مسلسل مبتلا رہے۔ لیکن انہوں نے صبر و استقامت کا پیکر بن کر یہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلیں، نہ تو منہ پر کوئی حرف شکایت لائے اور نہ ہی عقیدہ و ایمان میں کوئی خلل واقع ہوا، نہ وہ ہدایت و صداقت کی راہ سے ہٹے اور نہ ہی مایوسی اور ناامیدی کے گڑھے میں گرے۔ اپنے رب کے حضور صرف اتنا کہا:

أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ [2]

ترجمہ: "مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے"

جب وہ اس آزمائش پر پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی تمام کھوئی ہوئی چیزیں دگنا کر کے پلٹا دیں اور ان کی تعریف ان الفاظ میں کی:

إِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ط نِعْمَ الْعَبْدُ ط إِنَّهٗ أَوَّابٌ [3]

ترجمہ: "بلاشبہ ہم نے اسے صابر، بہترین بندہ اور رجوع کرنے والا پایا"

اللہ تعالیٰ کا یہ مستقل طریقہ ہے کہ مختلف انداز سے اپنے بندوں کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ ان میں وسائل رزق کی کمی بیشی بھی شامل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَ

---

[1] سورۃ النمل: ۴۰/۲۷

[2] سورۃ الانبیاء: ۸۳/۲۱

[3] سورۃ ص: ۴۴/۳۸

☆☆☆ میں نے امام شافعی سے زیادہ کسی کو عقل والا نہیں پایا (ابو عبید) ☆☆☆

الثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۙ؎

ترجمہ: "ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے آزمائیں گے۔ ان حالات میں صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔"

مذکورہ بالا آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے درجات معیشت میں تفاوت اپنی وسیع تر حکمتوں کے پیش نظر رکھا ہے ان میں ایک معاشی و سماجی امن و استحکام، دوسری لوگوں کا ایک دوسرے سے کام لینا، اور تیسری لوگوں کی آزمائش کرنا ہے۔ علاوہ ازیں ان تینوں حکمتوں سے وابستہ بے شمار دوسری حکمتیں بھی ہیں جن کا ہم روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ مقرر کیا ہے اس لیے ہر اعتبار سے مفید بھی ہے اور اٹل بھی اور فطرت کے عین مطابق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فطرت اور قوانین فطرت کا بھی خالق ہے۔ ساری دنیا مل کر فطرت کے اس قاعدے اور کلیے کو تبدیل نہیں کر سکتی اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کرے گی تو خود فطرت سے جنگ کرے گی، اور فطرت سے جنگ خود انسان کی اپنی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس سے ان کے پورے نظام میں خلل واقع ہوتا ہے۔ دور حاضر میں اس کا تجربہ اشتراکیت نے کر کے دیکھ لیا ہے اس نے "معاشی مساوات" کا نعرہ لگا کر اس تفاوت کو مٹاتے مٹاتے انسانوں کے تمام حقوق و آزادیوں کو پامال کر دیا لیکن پھر بھی عملاً یہ تفاوت ختم نہ کر سکے، مناصب، اختیارات، وسائل، سہولیات اور آمدنیوں میں فرق آزاد معیشت سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ جن لوگوں کا نام لے کر اور جن کے مفادات کا نعرہ لگا کر زبردستی ان پر یہ غیر فطری نظام مسلط رکھا گیا تھا، خود وہی چیخ اٹھے اور انہوں نے اسے اتار پھینکا ہے۔ اور اس کے بانیوں کے مجسموں کو زمیں بوس کر دیا ہے اور اس کی ہر ہر علامت کو مٹانے کے درپے ہو گئے ہیں۔

اس کے برعکس دوسرا نظام جو اس وقت تقریباً ساری دنیا پر مسلط ہے، وہ نظام سرمایہ داری ہے۔ جس کی بنیاد سرمائے پر ہے جو ایسے لوگوں کو پیس کر رکھ دیتا ہے جن کے پاس سرمایہ نہیں ہے جو معاشی تفاوت کو فطری نہیں رہنے دیتا بلکہ مصنوعی مداخلتوں، اجارہ داریوں، بے اعتدالیوں اور فاسد ظالمانہ کاروائیوں کی کھلی چھٹی دے کر پورے معاشرے کو حریص، لالچی، خودغرض، بے رحم اور سفاک سرمایہ دار دل

؎ سورۃ البقرۃ : ۲/۱۵۵

اور جاگیر داروں کے قبضے میں دے دیتا ہے۔ یہ لوگ "معاشی مساوات" کے بالمقابل "معاشی آزادی" کے پُرفریب نعرے کے ذریعے سارے وسائلِ رزق پر قابض ہو جاتے ہیں اور سود، جتھہ بندی، احتکار و اکتناز، دھوکہ، غبن، ملاوٹ، اشتہار بازی اور دیگر بے شمار طریقوں سے معیشت کی رگ رگ کا خون نچوڑ لیتے ہیں اور تمام انسانوں کو مہنگائی، بیروزگاری، فقر و افلاس اور شدید معاشی بحران سے دوچار کر دیتے ہیں اور بڑی چالاکی اور عیاری سے عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہی ان کے حقیقی خیر خواہ ہیں۔ اس طرح خود انہیں کے اعتماد اور دولتوں سے سیاست، معیشت، معاشرت، ابلاغیات اور قانون کے دیوانوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

مجلس و آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آور ہے

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں نظام عوام کا استحصال کرتے ہیں اور معاشی تفاوت کی خلیج کو وسیع کر دیتے ہیں، ان کے خوش کن نعرے محض دھوکہ اور فریب ہیں۔ ان سے ایک عام آدمی کی مشکلات و مصائب کا مداوا ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ افراط و تفریط کا شکار ہیں اور طبقاتی تقسیم ان کا خاصہ ہے۔

ان کے برعکس ایک ہمہ گیر اور جامع معاشی نظام وہ ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ جو اپنے مقاصد روح، مزاج اور تقسیم دولت کے طریقِ کار اور اثرات و نتائج کے اعتبار سے بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ درجاتِ معیشت کے جس تفاوت کا اسلام قائل ہے وہ یہ تفاوت نہیں ہے جس سے آج پوری دنیا دوچار ہے۔ جس کا ہم عملی طور پر صبح و شام مشاہدہ کر رہے ہیں۔ جو اجارہ دار طبقوں کے ظلم، استحصال، سازشوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ جو نہ فطری ہے نہ اخلاقی ہے، نہ قانونی ہے اور نہ ہی انسانی، یہ عہدِ حاضر کے ظالمانہ نظاموں کی پیدا کردہ ہے۔ یہ مصنوعی تفاوت ہے جو طلب و رسد کی فطری قوتوں پر حکومتوں اور سرمایہ داروں کے غاصبانہ کنٹرول کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ جس سے تمام معاشرے مسلسل طبقات میں بٹتے جا رہے ہیں۔ جو سرمایہ دار و مزدور، محتاج و غنی، جاگیر دار و کسان، امیر و غریب، حقوق یافتہ و محروم کی صورتوں میں نمایاں ہیں۔ ان میں طبقاتی کشمکش کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے جو معیشت کے تمام شعبوں اور دائروں پر محیط ہے۔ اس سے انتشار و افتراق بھی پیدا ہو رہا ہے اور انسانی

و مادی وسائل کا ضیاع بھی، موجودہ وضعی نظاموں کے ہوتے ہوئے اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں ایک تو اس لیے کہ اس کشمکش کے پیچھے کوئی اخلاقی اصول کارفرما نہیں ہے۔ اس کا مدار لالچ، خودغرضی اور دباؤ پر ہے، اور دوسرا اس لیے کہ ان نظاموں نے اسے فلسفیانہ بنیاد فراہم کی ہے، ان کے نزدیک یہ جدی عمل اور تصادم ارتقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ کیونکہ کائنات میں جہد احیاء (ST ruggle To Revive) اور بقائے اصلح (Survival of Fittst) کا اصول کارفرما ہے اور فطرت کا قانون یہ ہے کہ "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"۔

اسلام اس مصنوعی تفاوت کو ختم کرنا چاہتا ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں فساد کا باعث بنتی ہے، جو معیشت کو تباہ و برباد اور اصل حقداروں کو جائز صلے سے محروم کر دیتی ہے یہ تفاوت خالق کائنات کی مرضی کی بنا پر نہیں بلکہ یہ اس کے خلاف بغاوت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہو رہی ہے اس لیے اس کو مٹانے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر ایک نیا نظام استوار کیا جائے اور ایسے تمام نظاموں کی بساط لپیٹ دی جائے جو تفاوت کو بھی پیدا کرتے ہیں اور تصادم بھی، اسلام اپنے خطۂ اقتدار میں اصلاحی اور قانونی تدابیر سے اس طرح کے مصنوعی تفاوت اور اس کے ذرائع کو مٹا دیتا ہے، احتکار، اکتناز، جتھہ بندی، اجارہ داری، سودی کاروبار، جوا، سٹہ، سب اسلام میں ممنوع ہیں اور یہ قابل گرفت تعزیری جرائم ہیں۔ جو اخلاقی اور قانونی دونوں اعتبار سے غلط ہیں۔ علاوہ ازیں ہر ایسا کاروبار اور طریقہ غلط ہے جس میں ایک کا فائدہ دوسرے لوگوں، اداروں یا پورے معاشرے کے لیے نقصان و زحمت کا باعث ہو، اس کا فیصلہ بدلتے حالات کے مطابق علماء فقہاء اور اہل فکر و فن خود ہی کر سکتے ہیں۔

اسلام صرف اس تفاوت کو درست سمجھتا ہے جو خود ساختہ نہ ہو بلکہ خالصتاً فطری ہو، یعنی ذہانتوں، قابلیتوں، استعدادوں، مہارتوں اور محنت کی نوعیت، کمیت اور کیفیت، سرمائے کی مقدار، خطر و نقصان کا اندیشہ مول لینے اور قدرتی حالات کے تغیر و تبدل سے پیدا ہو رہی ہو، اسلام اسے نہ تو مستقل حیثیت دیتا ہے اور نہ ہی مصنوعی طریقے سے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ حلال و حرام کی قید کے ذریعے اسے کنٹرول کرتا ہے، مواقع کی یکسانیت کے ذریعے تبدیل کرتا ہے اور زکوٰۃ و انفاق کے ذریعے تحلیل کرتا ہے۔ اسلام کا بہت بڑا معاشی اصول "گردش دولت" ہے وہ اس بات

کو سخت ناپسند کرتا ہے کہ دولت چند لوگوں یا خاندانوں یا طبقوں یا ملکوں میں مرتکز ہو جائے۔ اس لیے اموال فے کی مستحقین فہرست پیش کر کے اس کی روح یہ بیان کی ہے کہ:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ [1]

ترجمہ: "تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے"

اسلام نے صرف دولت، تقسیم دولت اور تبادلہ دولت کے جو زریں اصول متعین کیے ہیں ان سب کی روح گردش ہے۔ چنانچہ نفقات، کفارات، صدقات، وراثت، وصیت، ہبہ وغیرہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔

علاوہ ازیں اسلام کے نزدیک درجات معیشت کے اس فطری تفاوت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لوگوں کو حالات کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ جسے چاہیں سربلند کریں اور جسے چاہیں نیست و نابود کر دیں۔ اور مختلف طبقات اور گروہ مقابلہ و مسابقت کی مادی دوڑ میں ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے اور ہڑپ کر جانے کے لیے کوشاں ہوں اور حکومت حالات کے جبر اور طبقات کے استبداد کا تماشائی بن کر مظاہر دیکھے۔ بلکہ تصور خلافت کی بنا پر اس کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ ہر طرح کی ناانصافیوں اور زیادتیوں کا ازالہ بھی کرے اور ان کی راہیں بھی مسدود کر دے، تاکہ کوئی کسی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے اور پورے نظام معیشت میں طلب و رسد کے قوانین اور فطری عوامل صحیح معنوں میں کارفرما رہیں اور ہر طرح کی مصنوعی مداخلتیں بند کر دی جائیں۔ اس کے باوجود اگر کچھ لوگ اپنی ضروریات کے مطابق نہ کما سکیں تو ان کی کفالت اور بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کے ذمے ہے، تاکہ کوئی محروم نہ رہے۔ زکوٰۃ کا پورا شعبہ اس غرض کے لیے قائم کیا گیا ہے کہ تلاش معاش میں پیچھے رہ جانے والے لوگوں کو نامساعد حالات کا تر نوالہ بننے سے بچایا جائے اور جو لوگ ان میں قابل کار ہوں، انہیں دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا جائے اور جو لوگ مستقل طور پر مجبوری و معذوری سے ہمکنار ہو جائیں تا دم مرگ ان کی تمام معاشی ضروریات پوری کی جائیں۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر زکوٰۃ قرضے کی آمدنی ناکافی ہو جائے تو اہل ثروت پر مزید ٹیکس لگا کر حکومت کفالت عامہ کا اہتمام کرے۔

---

[1] سورۃ الحشر: ۵۹/۷

اسلام درجاتِ معیشت کی بجائے "حقِ معیشت" میں مساوات کا قائل ہے۔ اسلامی ریاست میں بسنے والے ہر مسلم و غیر مسلم، عورت و مرد اور پیر و جواں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے جب، جہاں اور جتنا کمانا چاہے کما سکتا ہے۔ اسے ترقی کے یکساں مواقع اور حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام اشیاء کو سارے انسانوں کے فائدے اور استفادے کے لیے بنایا ہے، کسی خاص خاندان، نسل، طبقے، گروہ، قوم یا ملک کے لیے نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ [1]

ترجمہ: "ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا ہے اور تمہارے لیے سامان زیست پیدا کیا ہے"

اس آیت میں سارے انسانوں کو بحیثیت انسان مخاطب کیا گیا ہے اس لیے ایسا انتظام کرنا ناگزیر ہے، جس میں سارے انسانوں کو اپنے ذوق، صلاحیت اور جدوجہد کے مطابق زمین کے اوپر اور اس کے اندر پائے جانے والے بے شمار وسائل و ذرائع سے بھرپور فائدے حاصل کرنے کے یکساں مواقع میسر ہوں، چنانچہ ہر ایسا اصول، ضابطہ، نظام اور طریقہ غلط ہے جو مصنوعی امتیازات، ناروا بندشوں اور اجارہ داریوں کا باعث بنے، جس میں مخصوص طبقات اور اہل اقتدار و ثروت کے مفادات کا تحفظ کیا گیا ہو جو اجتماعیت و عوام الناس کے مقابلے میں انہیں کی فوقیت و بالادستی کا ضامن ہو، اس لیے کہ اسلام کسی طبقے کا نمائندہ اور وکیل نہیں ہے، یہ تو پوری انسانیت کا خیر خواہ ہے اور ایک عالمگیر اور جہانی نظریہ ہے۔ اور زندگی کے تمام شعبوں میں عدل کو قائم کر کے تمام لوگوں کو اس کا پابند کر دیتا اس کا مطمع نظر ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ [2]

---

[1] سورۃ الاعراف: ۷/۱۰

[2] سورۃ الحدید: ۵۷/۲۵

ترجمہ:۔ "ہم نے اپنے رسولوں کو ہدایت و نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں"

اسلام کے نزدیک معاشی عدل یہ ہے کہ تمام انسانوں کو کمانے کے یکساں حقوق اور مواقع میسر ہوں۔ حلال و حرام کی قید سب کے لیے یکساں ہو۔ اعمال و افعال کی جزا و سزا کا معیار یکساں ہو۔ اپنی ملکیت و کمائی پر حقوق و اختیارات مساوی ہوں، اور قوانین کے سامنے امیر و غریب، حاکم و محکوم، قوی و کمزور، اعلیٰ و ادنیٰ، کالا و گورا، عربی و عجمی، مرد و عورت، چھوٹا و بڑا اور مسلم و غیر مسلم سب برابر ہوں، کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ برتا جائے اور سب کے جذبات و احساسات، ضروریات و مفادات کا پورا پورا احترام کیا جائے۔ عدل و مساوات کے ان تصورات کو عملی سانچوں میں ڈھالنے اور محسوس حقیقت کا روپ دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی ریاست معرض وجود میں آئے جو اپنی قوت اور وسائل کے ذریعے احکام خداوندی کو نافذ کرکے ایک مثالی معاشرہ دنیا کے سامنے پیش کردے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور ان کے بعد خلفائے راشدین نے اپنے قول و عمل سے ایسا کرکے دکھایا۔ انہوں نے حق معیشت میں مساوات کے تصور کو پورے معاشی نظام، معاشی سرگرمیوں اور معاشی پالیسیوں کی بنیاد بنایا، اور تمام ناجائز مداخلتیں بند کردیں۔ جہاں تک ریاست کے اپنے بیت المال اور وسائل کا تعلق ہے اس میں تو بطور خاص مساوی حقوق کا اہتمام کیا، مال غنیمت و خراج کی تقسیم اور سرکاری خزانے سے وظائف کے تعین میں یہی اصول کارفرما رہا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) نے اپنی خلافت کے پہلے سال غنیمت تقسیم کی تو انہوں نے آزاد، غلام، عورت اور اس کی خادمہ سب کو دس دس درہم دیئے، دوسرے سال سب کو بیس بیس درہم دیئے[1] بعض لوگوں نے کہا کہ آپ نے تمام لوگوں کو برابر کردیا ہے حالانکہ بہت سے لوگوں کے فضائل ان کی ترجیح کی سفارش کرتے ہیں تو جواب دیا "فضائل کا ثواب اللہ تعالیٰ دے گا، یہ تو معاش کا معاملہ ہے، اس میں مساوات ہی بہتر ہے"[2]

---

[1] طبقات ابن سعد : ۱۹۲/۳

[2] کتاب الاموال : ۲۴۵

حضرت عمر فاروق رضؓ نے بھی اس پالیسی کو آگے بڑھایا اور بیت المال میں سب لوگوں کا حق تسلیم کیا اور اسے ادا کرنے کا عزم کیا اور اپنے آپ کو تمام لوگوں کے برابر قرار دیا، البتہ وظائف کی مقدار میں اسلام میں سبقت، اس کی راہ میں قربانیوں اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قربت کی بنا پر درجہ بندی کی چنانچہ حضرت سائب بن یزید سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضؓ کو تین مرتبہ کہتے ہوئے سنا۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں لوگوں میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا اس مال میں حق نہ ہو کہ وہ اسے دے دیا گیا یا روک لیا گیا، ان میں مملوک غلام کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں جو کسی سے زیادہ حقدار ہو اور میں خود بھی اس معاملے میں ایسا ہوں جیسا کوئی اور فرد، لیکن ہم لوگ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق کے مطابق اپنے مراتب و اقسام پر ہیں۔ ایک شخص اور اس کا اسلام کی راہ میں مصیبت جھیلنا، ایک اور شخص اور اس کا قبول اسلام میں قدیم ہونا، ایک اور شخص اور اسکی اسلام میں بے نیازی، ایک اور شخص اور اس کی اسلام میں محتاجی وغیرہ، اگر میں زندہ رہا تو کوہ صفا کے چرواہے کے پاس بھی اس مال میں سے اس کا حصہ ضرور پہنچے گا، حالانکہ وہ اپنے مقام پر ہوگا۔"[1]

بعد میں انہوں نے درجہ بندی کے سلسلے میں اپنی رائے سے رجوع کرلیا چنانچہ ان کے خادم حضرت اسلم سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضؓ کو یہ کہتے سنا۔

"اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو بالضرور بعد میں آنے والے لوگوں کو پہلے والوں میں شامل کردوں گا تاکہ وہ سب برابر ہو جائیں"[2] ایک اور روایت کے مطابق فرمایا "سب سے کم مرتبے والوں کو سب سے اعلیٰ مرتبے والے سے ملا دوں گا۔"[3]

---

[1] کتاب الخراج : ۴۶، طبقات ابن سعد : ۳/۲۹۹

[2] " ، کتاب الاموال : ۲۴۵

[3] طبقات ابن سعد : ۳/۳۰۲

اسی طرح اموالِ فئے کے بارے میں حضرت علیؓ کا طرزِ عمل بھی حضرت ابوبکرؓ کی طرح مساویانہ تقسیم ہی تھا[1] حق معیشت میں مساوات کے اس اسلامی تصور کا یہ نتیجہ نکلا کہ صدر اسلام میں خصوصاً اور مابعد کے مسلم معاشروں میں عموماً درجاتِ معیشت میں تفاوت کے باوجود طبقاتی کشمکش کا کوئی نظریہ کبھی فروغ نہیں پاسکا اور نہ ہی معاشی تفاوت کی بنا پر طبقاتی تصادم و انتشار برپا ہوا۔ جیسا کہ لادینی معاشروں میں عام طور پر رہا ہے۔ کیونکہ وہ معیشت کے کسی اعلیٰ انسانی و اخلاقی اصول کے بجائے انسانوں پر انسانوں کی حاکمیت اور معاشروں پر "ارباب من دون اللہ" کی بالادستی و تسلط کے زیر اثر رہے ہیں۔ دورِ جدید میں مسلمانوں کی معاشی غلامی و بدحالی، انتشار و افتراق اور کہیں کہیں طبقاتی تفریق و تصادم کا بنیادی سبب یہی ہے کہ فکری و عملی طور پر نظام سرمایہ دارانہ و اشتراکیت کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور اسلامی تصورات و اقتدار کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

اسلامی معاشرے کی اساس تعاون ہے۔ جو زندگی کے تمام شعبوں کو منظم و مضبوط کرتا ہے۔ فرد اور فرد کے مابین، فرد اور اجتماع کے مابین، گروہوں اور اداروں کا دوسرے گروہوں اور اداروں کے ساتھ تعاون ہی وحدت و اخوت کی بھی پیش خیمہ بن جاتا ہے اور معاشی استحکام و ترقی کا بھی۔ شرط یہ ہے کہ وہ صرف نیکی، بھلائی اور جائز معاملات کے اندر ہو، ظلم، استحصال اور بدیانتیوں کیلئے نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ [2]

ترجمہ: "نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ و زیادتی کے کاموں میں کسی سے تعاون نہ کرو۔"

اسلام نے مالک و ملازم، آجر و اجیر، زمیندار و کسان، امیر و غریب، سب کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور مددگار اور بھائی قرار دیا ہے۔ ان کے باہمی تعلق کی نوعیت آقا و غلام کی نہیں بلکہ برابر کی سطح پر کام کرنے والے کاروباری فریق اور شرکائے کار کی ہے جن کے معاہدے کی بنیاد یہ ہے کہ ایک سرمایا لگائے گا اور دوسرا محنت، دونوں کا منصب، کام کی نوعیت و حدود اور ذمہ داریاں مختلف ہونے۔

---

[1] کتاب الاموال : ۲۴۵

[2] سورۃ المائدہ : ۲/۵

کے باوجود مفاد و بھلائی مشترک ہے۔ دونوں کے ایک و دوسرے پر حقوق ہیں جن کو ادا کرنے کے وہ یکساں طور پر ذمہ دار اور جوابدہ ہیں، قانون کے آگے بھی اور اپنے رب کے آگے بھی۔ دونوں بطور انسان مقام و مرتبہ اور عزت و احترام کے مستحق ہیں جیسے دو سگے بھائی وسائل کی کمی وبیشی کے باوجود یکساں حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہاں اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ کون اپنی ذمہ داری کو صحیح طور پر ادا کرنے والا اور اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا ہے اور کون کم،

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ [1]

ترجمہ: "تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ ڈرنے والا ہے۔"

اسلام نے درجات معیشت کے تفاوت کو تو تسلیم کیا ہے کہ اس میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں لیکن مال و دولت کو سماجی حیثیت کی بنیاد نہیں بننے دیا، کیونکہ تمام معاشی خرابیوں کی جڑ مال و دولت نہیں ہے بلکہ اس کی سماجی اساس ہے۔ مادہ پرستانہ نظاموں میں ایک گروہ کو مال و دولت کی وجہ سے محض آسائشیں، سہولیات اور فراخی حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ قوت حاصل ہو جاتی ہے جس کے ذریعے وہ بڑے بڑے سماجی، سیاسی، معاشی، قانونی اور فکری مراکز پر قابض ہو جاتا ہے اور معاشرے میں فساد و بگاڑ پیدا کرنے اور خلق خدا کو اپنی خواہشات نفس کا غلام بنانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور تمام وسائل و ذرائع کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سفارش، رشوت، اثر و رسوخ، تعلقات، اور اقتدار و اختیار کے ذریعے اپنی اولاد، خاندان اور طبقے کے لیے ترقی کی راہیں ہموار کرتا ہے اور عوام الناس کے آگے مصنوعی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ اگر وہ سیاسی اختیارات و مناصب پر تسلط حاصل کرتا ہے تو فرعون کی طرح اپنے آپ کو اقتدار اعلیٰ کا مالک سمجھتے ہوئے أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ [2] کا دعویدار بن جاتا ہے اور اگر اسے مال و دولت کی فراوانی حاصل ہوتی ہے تو اس پر اترانے لگتا ہے۔ اور اسے اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت اور علم معیشت میں اپنی سمجھ بوجھ و مہارت کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے قارون کی طرح اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

---

[1] سورۃ الحجرات: ۴۹/۱۳

[2] سورۃ النّٰزعٰت: ۷۹/۲۴

قَالَ اِنَّمَا اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ [1]

ترجمہ: "اس نے کہا "یہ تو مجھے اس علم کی بنیاد پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔"

ہر دور میں انبیاء کرام کی دعوت کو کھاتے پیتے لوگوں اور حقوق یافتہ طبقوں نے اس لیے مسترد کر دیا کہ وہ ان کی سماجی حیثیت کو چیلنج کر رہی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر مروجہ جاہلانہ نظام ختم ہوا تو ان کے اپنے تسلط کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور پسے ہوئے محروم لوگوں کو سربلندی و سرفرازی ملے گی۔ اس لیے وہ ایسے پیغام و نظام کو برحق ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ عام لوگوں پر اپنا رعب برقرار رکھنے، انبیاء کو لاجواب کرنے اور اپنے دلوں کو جھوٹی تسلیاں دینے کے لیے ہی پراپیگنڈہ کرتے تھے کہ ان کی کثرت مال و اولاد جس طرح دنیا میں ان کے لیے عزت و شرف کا ذریعہ ہے اسی طرح اگر آخرت ہوئی تو اس میں بھی وہ انہیں عذاب سے ہمکنار نہیں ہونے دے گی۔ قرآن حکیم نے ان کے اس رویے اور تصور کو یوں بیان کیا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ [2]

ترجمہ: "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو "جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے" انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں"

ان کے اس زعم باطل کا جواب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہی بتایا:

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ [3]

---

[1] سورۃ القصص: ۲۸/۷۸

[2] سورۃ سبا: ۳۴/۳۵ و ۳۴

[3] سورۃ سبا: ۳۴/۳۶

ترجمہ: "اے نبی، ان سے کہو میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ناپا تلا عطا کرتا ہے مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے"

یعنی یہ اہل ثروت درجات معیشت کی اصل حکمت ہی سے ناواقف ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ان کے لیے عزت و تکریم، کامیابی و کامرانی اور مقرب خداوندی ہونے کی دلیل ہے۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک اصل معیار و پیمانہ، ایمان اور عمل صالح ہے جن لوگوں کی ترقی کی بنیاد یہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے احکام، نظام اور آیات کی مخالفت ہے وہ تو عذاب کے مستحق ہیں۔ چنانچہ اگلی آیات میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ ۝ وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ [1]

ترجمہ: "یہ تمہاری مال و دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو..... ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے عمل کی دہری جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے، رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے"

اسلام یہ کہتا ہے جو لوگ ظلم، استحصال، حرام خوری اور بغاوت و نافرمانی کے ذریعے مال و دولت حاصل کرتے ہیں، وہ کسی عزت و فضیلت کے مستحق نہیں ہیں، حقیقی معنوں میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی، جا ہلانہ نظام مصنوعی طور پر انہیں لوگوں کے سروں پر مسلط کر دیتے ہیں جو خلوص دل سے نہیں بلکہ ان کے شر و فساد سے محفوظ رہنے کے لیے، مجبوراً انہیں سلام کرتے ہیں اور ان کی بات مانتے ہیں یا ان کے کسی دام فریب میں مبتلا ہو کر ان کے پیچھے چلتے ہیں، لیکن جب حقیقت حال ان

---

[1] سورۃ سبا: ۳۷، ۳۸/۳۴

ایک عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے کہ چاند کی فضیلت دوسرے تمام ستاروں پر (سنن ابو داود و ترمذی)

کے سامنے آتی ہے تو ان پر لعنتیں بھیجتے ہیں، ان کے برعکس صداقت، دیانت اور امانت و انصاف کے ساتھ، جائز ذرائع سے کمانے والے لوگ صحیح معنوں میں عزت و تکریم کے مستحق ہوتے ہیں وہ مقدار کے اعتبار سے مال و دولت کم حاصل کریں یا زیادہ، معاشرہ دل کی گہرائیوں سے ان کی قدر کرتا ہے اور انہیں جو سماجی حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ اصلی اور حقیقی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کو عدل و انصاف ملتا ہے سائل و محروم کی مدد ہوتی ہے۔ حقداروں کی دادرسی ہوتی ہے اور نیکیوں اور بھلائی کے کاموں کی ترویج و اشاعت ہوتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں محض مال و زر کی بہتات کی وجہ سے کسی سرمایہ دار، جاگیردار اور حکمران کا نام روشن نہیں رہا نہ ہی انسانیت نے انہیں اسی وجہ سے خراج تحسین پیش کیا۔ بلکہ ہمیشہ ان لوگوں کو عزت و تکریم سے یاد رکھا اور ان کی زندگیوں سے ایک متحرک اور جذبہ حاصل کیا اور ان کے کاموں کو نمونۂ عمل بنایا جو راست باز و صالح تھے۔ نمرود، فرعون، سکندر اعظم، قارون، ہامان، ابوجہل، ابولہب، قیصر و کسریٰ وغیرہ جیسے مال و اختیار رکھنے والے لوگوں کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے جلیل القدر اور دنیوی مال و متاع سے بے نیاز انبیاء کرام اور ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، بلالؓ، صہیبؓ، سلمانؓ جیسی مقدس ہستیوں نے عزت و رفعت پائی۔ اسلام ایسے ہی کرداروں کی سماجی حیثیت کو ابھارنا چاہتا ہے اور دنیا و آخرت دونوں جگہوں پر فضیلت و شرف کا حقدار قرار دیتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا۔ [1]

ترجمہ: "ذرا دیکھو، دنیا ہی میں ہم نے بعض لوگوں کو بعض پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت میں تو ان کے درجے اور بھی بلند ہوں گے اور ان کی فضیلت اور بھی بڑھ چڑھ کر ہوگی"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام عام زندگی میں سماجی حیثیت کی بنیاد معیشت کے درجات کو نہیں بلکہ ذاتی اوصاف کو بناتا ہے، جن میں ایمان، تقویٰ، امانت و دیانت اور صداقت و شرافت وغیرہ

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل: ۲۱/۱۷

☆☆☆ میں نے امام شافعی سے زیادہ کسی کو عقل والا نہیں پایا (ابو عبید) ☆☆☆

شامل ہیں یہ جن لوگوں میں زیادہ ہوں وہی عزت واحترام کے زیادہ لائق ہیں خواہ ان کی مالی حیثیت کتنا کم کیوں نہ ہو۔ سرداران قریش کو اسلام کے خلاف جو بڑے بڑے اعتراضات تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ نچلے درجے کے لوگوں کو ان کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

سماجی حیثیت کا ایک اور دائرہ سرکاری مناصب وعہدے ہیں۔ وہ جن لوگوں کو میسر آتے ہیں معاشرے میں ان کا مقام و مرتبہ بلند ہوجاتا ہے اور ان کے پاس کچھ ایسے اختیارات و وسائل آجاتے ہیں کہ جن کی بنیاد پر کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ وہ اگر اوصاف حمیدہ سے متصف نہ ہوں اور ان کے دلوں میں خدا خوفی اور ملی وانسانی ہمدردی کا جذبہ نہ ہو تو محض قوانین و ضوابط انہیں ظلم واستحصال سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے اسلام نے ان پر تعیناتی کے لیے اہل ثروت کے کسی اضافی حق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ میرٹ کے اصول کو رواج دیا ہے۔ اور سب سے بنیادی میرٹ تو اس کے ذاتی اوصاف ہی ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اہلیت کے ابتدائی معیار پر وہ پورا پورا اترتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ متعلقہ شعبے اور ادارے کو کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ متعلقہ فن کے بھی ماہر ہوں اس میں خصوصی ذوق وشغف رکھتے ہوں اور اسے سنبھالنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشاورت، کتابت وحی، سفارت، انتظام انصرام، تعلیم وتربیت، فقہ وعدالت، زکوٰۃ، صدقات کی وصولی اور جنگی مہمات کے لیے ہمیشہ ایسے صحابہ کرام کو مقرر فرمایا جو زیادہ اہلیت وصلاحیت رکھتے تھے۔ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اسی روایت پر عمل کیا۔ چنانچہ درجات معیشت کے بلند ہونے کی وجہ سے کبھی کسی شخص کو یا اس کی اولاد کو فوقیت نہیں دی گئی۔ فاروق اعظمؓ کا ارشاد ہے کہ :

لا تنظروا الی صلوٰۃ امرىء ولاصیامہ، ولکن انظروا الی صدق حدیثہ اذا حدث والی ورعہ اذا اشفی والی امانتہ اذا ائتمن[1]

ترجمہ :۔ کسی کے نماز، روزے سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ دیکھو کہ بات کرتے وقت وہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ، اس کا تقویٰ فراغت وامیری کے دور میں بھی قائم

---

[1] ابن جوزی، تاریخ وسیرت عمرؓ : ۱۹۵

رہتا ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جاتی ہے تو وہ خیانت نہیں کرتا۔"

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں، ان کے مقرر کردہ عامل مکہ، حضرت نافع بن عبدالحارث، حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم نے وادی والوں پر کسے عامل بنایا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ابن ابزیٰ کو، پوچھا وہ کون ہے؟ جواب ملا کہ ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک غلام، فرمایا تم نے ایک غلام کو ان پر عامل مقرر کر دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ کتاب اللہ کے قاری و عالم ہیں اور ترکہ کو بانٹنا خوب جانتے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

اما ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم قد قال ان اللہ تعالیٰ یرفع بھذا الکتاب اقواماً ویضع بہ اٰخرین۔[1]

ترجمہ: "ہاں ایسا کیوں نہ ہو جبکہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کچھ لوگوں کو سربلند کرے گا اور کچھ کو گرا دے گا۔"

تقویٰ کے ساتھ اسلام نے ملازمتوں کا میرٹ دو اہم چیزوں کو بنایا ہے۔ ایک قوت اور دوسرا امانت، قوت میں انسان کی متعلقہ کاموں اور عہدوں کو سنبھالنے کے لیے ذہنی، جسمانی اور تکنیکی قوتیں، صلاحیتیں، استعدادیں، اہلیتیں اور مہارتیں شامل ہیں اس کا جائزہ دوسرے لوگ بھی لے سکتے ہیں اور انسان کو منصفانہ طور پر خود بھی اپنے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ اس منصب کو سنبھال سکتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول درخشندہ مثال کی حیثیت رکھتا ہے کہ!

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس امر کے لیے مجھ سے زیادہ قوی کے ہوتے ہوئے میں مقدم کر دیا گیا ہوں تو مجھے اس کا والی بننے کی بہ نسبت اپنی گردن کا مار دیا جانا زیادہ پسند ہوتا۔"[2]

دوسری چیز امانت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس عہدے کے تمام متعلقات کی نگہداشت وحفاظت کے تمام تقاضے پورے کر سکے۔ نہ تو خود خیانت کا مرتکب ہو اور نہ ہی افسران بالا اور

---

[1] مسند احمد بن حنبل: ۱/۲۵۹، صحیح مسلم: ۲/۲۰۱

[2] طبقات ابن سعد: ۳/۲۷۵

کسی سرزمین پر ایک حد کے نفاذ کی برکت وہاں چالیس روز نازل ہونے والی بارش کی برکت سے بہتر ہے

ماتحتوں کو خیانت، غبن، اسراف، وسائل کے ضیاع اور لاپرواہی و بددیانتی کا مرتکب ہونے دے۔ نہ تو ان کا حصے دار بنے اور نہ ہی اسے نظر انداز کرے بلکہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے ان کے غلط کاموں کی راہ میں حائل ہو جائے۔

اسلام نے قوت و امانت کی ان دونوں صفات کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اگر کسی کے پاس قوت تو ہے لیکن امانت نہیں ہے تو وہ شعبہ و ادارہ تباہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی طرح امانت تو ہے لیکن قوت نہیں ہے تو بھی وہ شعبہ و ادارہ ترقی کی شاہراؤں پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ دونوں صورتوں میں وہ منصب و عہدہ بے مقصد و بے مصرف ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے ان دونوں صفات کو حضرت شعیبؑ کی بیٹی کے ذریعے بہت خوبصورت انداز میں اجاگر کیا ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ان دونوں صفات کو محسوس کر کے ملازم رکھ لینے کا مشورہ ان الفاظ میں دیا تھا۔

يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ [1]

ترجمہ: "اباجان انہیں آپ ملازم رکھ لیجئے بے شک بہترین شخص جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو قوی اور امین ہو"

سماجی حیثیت کے اعتبار سے تیسرا بڑا دائرہ سربراہ مملکت کا ہے۔ یہ وہ منصب ہے جو معاشرے کے ہر طبقے پر ایک آدمی کو حاوی کر دیتا ہے۔ امیر و غریب، محتاج و غنی، سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان، سرکاری افسران و ملازمین سب اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس کے احکام و فیصلوں سے تمام معاشی سرگرمیوں اور پورے معاشی نظام پر مثبت و منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ گویا مادی اعتبار سے سب سے بلند اور موثر مقام و مرتبہ ہے۔ اسلام نے اس کا مستحق بھی درجات معیشت کے کے اعتبار سے کسی برتر شخص یا امیر زادے کو نہیں بلکہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ اعلیٰ اوصاف کے حامل، باصلاحیت شخص کو قرار دیا ہے جو ایمان و یقین، علم و فہم، دینی بصیرت، حکمت و تدبر، انتظامی معاملات اور سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قلبی و عملی تعلق میں سب سے بڑھ کر ہو اور اسی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز اور عزت و احترام کا محور ہو، جو ہر اعتبار سے قابل اعتماد و بھروسہ

---

[1] سورۃ القصص: ۲۶/۲۸

☆ الفقه حقيقته الفتح و الشق ☆ فقہ کے معنی ہیں کھولنا اور بیان کرنا ☆

ہو۔ کیونکہ یہ منصب شہنشاہی و حکمرانی کا نہیں بلکہ خلافت کا ہے جو ایک ذمہ داری و امانت ہے اور اس کا مقصد پیغمبرانہ دعوت و مشن کی ترویج و تنفیذ ہے۔ اس لیے اہل تر شخص کا انتخاب انتہائی ضروری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا [1]

ترجمہ:۔ "بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے خلیفہ کا انتخاب عمل میں آیا تو مسلمانوں نے مال و دولت کو نہیں بلکہ اسلام میں ان کی سبقت، شرافت و بزرگی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت اور یار غار ہونے کی سعادت اور نماز میں امامت کے منصب پر تقرری کو بنیاد بنایا [2] حضرت عمرؓ نے یہ فرما کر سب سے پہلے بیعت کی:۔

انت سیدنا وخیرنا واحبنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [3]

ترجمہ:۔ "آپ ہمارے سردار، ہم میں سب سے بہتر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں"

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم نے امیر خلافت پر نظر ڈالی ہم نے نبیؐ کو اس حالت میں پایا کہ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں آگے کر دیا۔ لہذا ہم اپنی دنیا کے لیے اس شخص سے راضی ہو گئے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دین کے لیے راضی ہوئے، چنانچہ ہم نے ابوبکرؓ کو آگے کر دیا" [4]

حضرت ابوبکر صدیقؓ معاشی اعتبار سے مستحکم و مضبوط نہیں تھے۔ چند سال قبل غزوۂ تبوک کے موقع

---

[1] سورۃ النساء: ۵۸/۴

[2] طبری: ۲۲۳/۳

[3] صحیح بخاری: ۱۹۴/۴

[4] طبقات ابن سعد: ۱۸۳/۳

پر تو اپنا سارا مال فی سبیل اللہ قربان کر چکے تھے۔ ان سے زیادہ مال و دولت رکھنے والے اصحاب موجود تھے۔ لیکن منصب خلافت پر ان کا انتخاب ان کے ذاتی اوصاف دین کی راہ میں قربانیوں اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رفاقت و محبت کی وجہ سے ہوا۔ اور ان کا دینی تشخص دینوی اعتماد کی بنیاد بنا۔

اسی طرح خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی ان کی اہلیت و صلاحیت کی بنیاد پر ہوا، مالی اعتبار سے ان کی حالت بھی اوسط درجے کی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تقرر سے قبل استصواب کے لیے مختلف بزرگوں کو بلایا تو حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے ان الفاظ میں رائے دی:

"اے خلیفہ رسولؐ وہ اوروں کی بہ نسبت آپ کی رائے سے بھی افضل ہیں مگر ان کے مزاج میں ذرا شدت ہے۔"

حضرت عثمان، اے بار الٰہا! میں عمرؓ کے باطن کو ان کے ظاہر سے بہتر سمجھتا ہوں، ہم میں سے ان جیسا کوئی دوسرا شخص نہیں۔ [1]

حضرت عمرؓ کی اہلیت و افضلیت کا تو تمام صحابہ کرامؓ کو اعتراف تھا مگر ان کی سختی و شدت سے خائف تھے اس لیے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں بعض اصحاب آئے اور یہ کہا کہ!

"اے خلیفہ رسولؐ! کل جب آپ اپنے رب سے ملیں گے تو اس کا کیا جواب دیں گے کہ آپ نے ہم پر ابن الخطاب کو خلیفہ بنایا؟ انہوں نے فرمایا کہ مجھے بٹھا دو، جب اٹھ کر بیٹھ گئے تو فرمایا! کیا تم لوگ مجھے اللہ سے ڈراتے ہو؟ میں کہوں گا کہ میں نے ان پر ایسے شخص کو خلیفہ بنایا ہے جو ان سب سے بہتر تھا۔ [2]

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر و عمرؓ دونوں کی سماجی حیثیت درجات معیشت میں کسی قسم کی فوقیت پر نہیں تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ ان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا!

---

[1] تاریخ طبری: ۴۲۸/۲

[2] طبقات ابن سعد: ۲۷۴/۳

☆☆☆ میں نے امام شافعی سے زیادہ کسی کو عقل والا نہیں پایا (ابو عبید) ☆☆☆

" دونوں ہدایت کے امام، راستہ پانے والے، راستہ بتانے والے، اصلاح کرنے والے اور کامیابی حاصل کرنے والے تھے جو دنیا سے اس طرح گئے کہ شکم سیر نہ تھے "[1]

علیٰ ہذا القیاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں بھی مذکورہ بالا اصول کارفرما ہے۔

یہ اسلامی نظام ہی کی شان و برکت تھی کہ لوگوں کے ذوق و مزاج اور پسند و ناپسند کے پیمانے بدل گئے۔ قیادت و سیادت کے مناصب کے لیے ان کی نظریں اہل ثروت و سرمایہ کی طرف نہیں بلکہ اعلیٰ اوصاف، صلاحیتوں کے حامل اور مضبوط سیرت و کردار کے مالک لوگوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ اس لیے کہ سماجی حیثیت کی بنیادیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس کے برعکس وہ پرستانہ نظام مال و دولت، نسب و نسل اور زبان و علاقے وغیرہ کو سماجی حیثیت کا مدار قرار دیتے ہیں حالانکہ ان میں کوئی بھی اخلاقی و انسانی وصف نہیں۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے مطالبے پر جب حضرت طالوت کو ان کا حکمران مقرر کیا تو ان کا ردعمل یہ تھا۔

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ[2]

ترجمہ: " وہ بولے! ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں حکمرانی و بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں، وہ تو کوئی بڑا مال دار آدمی نہیں ہے (نبی نے) جواب دیا! اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا اور اس کو علمی و جسمانی دونوں صلاحیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں "

ہر تہذیب و تمدن اور نظام و معاشرہ کے کچھ اساسی تصورات ہوتے ہیں جن پر وہ استوار ہوتا ہے اور اس کا مخصوص مزاج ہوتا ہے جس سے "ثقافتی ماحول" پیدا ہوتا ہے۔ وہ ماحول ایسی شخصیتوں کو پروان چڑھاتا، اور ابھار کر نمایاں کرتا ہے جو فکر و عمل کے اعتبار سے اس سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ

---

[1] طبقات، ابن سعد: ۳/۲۷۴

[2] سورۃ البقرہ: ۲/۲۴۷

ہوں جس طرح پہاڑی علاقوں کے پودے میدانی علاقوں میں پھل پھول نہیں سکتے اور سردی کی فصلیں گرمیوں میں سوکھ جاتی ہیں۔ اسی طرح طبقاتی، جاہلانہ نظاموں کا ثقافتی ماحول کبھی شرافت، اخلاق اور صداقت کے حامل لوگوں کو سربلند نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر میں تمام ملکوں اور پوری دنیا پر بحیثیت مجموعی ایسے اجارہ دار طبقے مسلط ہو گئے ہیں جو اہلیت و صلاحیت رکھنے والے غریب انسانوں کے لیے ترقی کی راہیں مسدود کرتے جا رہے ہیں۔ بقول اقبالؒ

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا[1]

تمام عالم انسانیت کی نجات کا صرف ایک راستہ ہے کہ ایسے تمام نظاموں کی بساط لپیٹ دی جائے اور اسلام کے عادلانہ اور متوازن نظام کو عملی طور پر نافذ کر دیا جائے۔

سماجی حیثیت کا چوتھا اور سب سے بلند تر دائرہ نبوت و رسالت کا منصب ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ معزز و مکرم کسی مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خالق و مالک کائنات کسی کو اس دھرتی پر اپنا رسول و پیغمبر بنا دے، اور زندگی کے تمام معاملات و مسائل میں براہ راست اس کی رہنمائی کرے اسے خطاؤں اور گناہوں سے منزہ مبرا کر دے اور اسے دنیا والوں کا ہادی و پیشوا بنا دے اور اس کی اطاعت و نافرمانی کو حق و باطل کا معیار اور جنت و دوزخ کا ذریعہ قرار دے۔ یہ منصب کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا ہے اسے اس پر سرفراز کیا ہے۔ جب ہم انبیاء کرام کی فہرست و احوال پر نظر ڈالتے ہیں تو یہی بات واضح ہوتی کہ چند ایک کے سوا باقی سب لوگ مال و دولت کے اعتبار سے نہایت کمزور تھے۔ حکمت خداوندی کا فیصلہ یہی تھا کہ ان کی عزت و تکریم کی اساس مادی وسائل کی ریل پیل اور اقتدار و اختیار کا رعب و دبدبہ نہ ہو بلکہ صداقت و شرافت، امانت و دیانت، راستبازی، اتباع وحی اور تعلق باللہ ہو۔ خاتم النبیینؐ کو یہ حکم دیا گیا:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى

---

[1] کلیات اقبال: ۶۵۹/۱

ایک عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے کہ چاند کی فضیلت دوسرے تمام ستاروں پر (سنن ابوداود و ترمذی)

وَالْبَصِيْرُ ط اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ [1]

ترجمہ: اے نبی! ان سے کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے، پھر ان سے پوچھو! کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟۔

بالکل یہی بات حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے سامنے کہی اس کے بعد آگے فرمایا:

وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ط اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ز اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ [2]

ترجمہ: اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی، ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔

یعنی تمہارے معاشرے نے اور تمہاری ذہنیتوں نے جن لوگوں کو اس لیے پست اور حقیر سمجھ رکھا ہے کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہے تو حقیقی معنوں میں وہ پست نہیں ہیں بشرطیکہ وہ قلب و نفس کی کیفیات اور جذبوں کے اعتبار سے راستباز ہیں، مال و دولت دراصل کامیابی و بھلائی کا کوئی پیمانہ نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان کی صلاحیتیں اور اوصاف تم سے کہیں زیادہ ہوں۔ اور ان کو صبر و توکل اور سکون و اطمینان اور عزت و وقار کی ایسی نعمتیں میسر ہوں جو ہر طرح کے مادی وسائل رکھنے کے باوجود تمہارے چشم تصور میں بھی نہ آسکتی ہوں۔

یہ ہے درجات معیشت کے سلسلے میں اسلام کا تصور، جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے درجات معیشت کے صرف فطری تفاوت کو تسلیم کیا ہے کیونکہ اس کے ساتھ بے شمار حکمتیں وابستہ ہیں، لیکن اسے مستقل حیثیت نہیں دیتا بلکہ حق معیشت میں مساوات کے ذریعے اسے تبدیل و تحلیل کرتا رہتا ہے

---

[1] سورۃ الانعام: ۵۰/۶

[2] سورۃ ہود: ۳۱/۱۱

اور معاشی جدو جہد کو اہلیت، صلاحیت کے مطابق منافع و اجرت کی بنیاد پر رواں دواں رکھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ کفالت عامہ کا اصول دیتا ہے تاکہ اگر کبھی کچھ لوگ بقدر ضرورت رزق حاصل نہ کر سکیں تو انہیں حالات کے حوالے کرنے کی بجائے انفرادی و اجتماعی اور نجی و سرکاری ذرائع سے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور معاشی سرگرمی میں بھرپور طور پر شریک ہونے کے قابل بنایا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام مال و دولت کے سماجی کردار کو محدود کر کے اعلیٰ اوصاف کو سماجی حیثیت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ انہیں اوصاف کو اختیار کرنے میں سرگرم عمل رہتے ہیں، مادی دوڑ میں مقابلہ بازی کی بجائے نیکی و بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور قیادت و سیادت کے منصب پر بھی ایسے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں جو قوی و امین ہوتے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو متعلقہ ذمہ داریاں سنبھالنے کی پوری اہلیت و استعداد اور قوت رکھتے ہیں اور دوسری طرف پوری دیانتداری و خلوص کے ساتھ تمام معاملات کو امانت سمجھ کر بجا لاتے ہیں اور ہر چیز کی پوری نگرانی و حفاظت کرتے ہیں۔ اس طرح اسلام کا پیدا کردہ سماجی ماحول پورے معاشرے کے پسند و ناپسند کے معیار کو تبدیل کر کے سیرت و کردار کے اعتبار سے مضبوط اور پاکباز لوگوں کو ابھار کر معاشرے کا رہنما بنا دیتا ہے۔ ایسے افراد کے ہاتھوں میں اختیارات و مادی وسائل کا آجانا پوری انسانیت کے لیے برکت و رحمت کا سبب بن جاتا ہے۔ ان کا مال و اسباب نہ تو دنیا و آخرت میں ان کے لیے کسی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی دوسرے انسانوں اور پورے معاشی نظام کے لیے بلکہ وہ اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے۔

لَا بَاسَ بِالْغِنٰی لِمَنِ اتَّقَی اللهَ عَزَّ وَجَلَّ وَالصِّحَّةُ لِمَنِ اتَّقٰی خَیْرٌ مِنَ الْغِنٰی وَطِیْبُ النَّفْسِ مِنَ النَّعِیْمِ[1]

ترجمہ: " اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کے لیے مال دار ہونے میں کوئی خطرہ نہیں۔ متقیوں کے لیے تندرستی مالداری سے بہتر ہے اور دل کا اطمینان و خوشی اللہ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔"

---

[1] سنن ابن ماجہ: ۲/۴۴

کسی سرزمین پر ایک حد کے نفاذ کی برکت وہاں چالیس روز نازل ہونے والی بارش کی برکت سے بہتر ہے

سرورکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب بھی کوئی مال آتا تو وہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے مستحقین تک پہنچ جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مال و دولت نے دین کے کتنے ہی کاموں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار سرانجام دیا اور کتنے ہی غلاموں کی گردنیں آزاد ہوئیں۔ حضرت عمرؓ کا بھی ذاتی مال اسلام کی سربلندی میں صرف ہوا اور خلق خدا کی مدد و معاونت کا ذریعہ بنا جب ان کے عہد میں فتوحات کے دروازے کھلے اور سرکاری خزانہ بھرا تو ریاست کے طول و عرض میں بسنے والے تمام انسانوں نے معاشی فلاح کے مناظر دیکھے۔ اور حقداروں کو ان کے حقوق ملے یہاں تک کہ شیر خوار بچوں اور غیر مسلموں تک نے استفادہ کیا اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دولت و ثروت نے رفاہی و فلاحی کاموں کو بام عروج تک پہنچایا مفلسوں اور ناداروں کے گھروں میں چولہے جلائے۔ زمانۂ قحط میں انہوں نے اپنے تجارتی سامان کو منہ مانگی قیمت پر فروخت کرنے کی بجائے مفت تقسیم کر دیا کہ لوگوں کی مجبوری و شدت احتیاج نفع اندوزی کی بجائے ہمدردی و فیاضی کا تقاضا کر رہی تھی اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرامؓ کا مال و اسباب انسانیت کی بھلائی پر صرف ہوا۔ اس سے وحدت و اخوت کے سرچشمے پھوٹے اور ہمدردی و تعاون کی نئی اور انوکھی قدریں معرض وجود میں آئیں۔

اسلام نے درجات معیشت کے اس اعلیٰ و ارفع تصور کو معاشی سرگرمیوں کو متحرک کرنے اور معاشی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ مادہ پرستانہ اور جاہلانہ نظاموں کے برعکس اسے طبقاتی تفریق و تقسیم اور بغض و عناد کی بنیاد نہیں بننے دیا۔ ہر درجے کے لوگوں کے حقوق و فرائض، دائرہ کار اور حدود و شرائط کا منصفانہ تعین کر کے انہیں باہمی معاون و مددگار بنا دیا ہے اور حسد و لالچ کی فتنہ انگیزیوں اور تباہ کاریوں سے افراد اور معاشرے کو بچانے کے لیے دو اہم احکام دیئے ہیں۔

ایک یہ کہ مال و دولت کے اعتبار سے بلند تر لوگوں کی طرف دیکھنے کی بجائے نیچے والے لوگوں کی طرف دیکھا جائے کیونکہ انسان کی مادی خواہشات کی کوئی حد نہیں ہے۔ اگر انسان اسے مقصود زندگی بنا لے تو پھر کبھی آرام و سکون کی نیند نہیں سو سکتا۔ نہ تو وہ لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات بہتر اور صاف ستھرے رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا شکر گزار و فرمانبردار رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أنظر إلى من هو تحتك ولا تنظر إلى ما هو فوقك فإنه أجدر

فضل العالم على العابد كفضل القمر على سائر الكواكب (سنن ابوداود و ترمذی)

اَنْ لَا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عِنْدَكَ[1]

ترجمہ: "ان کی طرف دیکھو جو مال و جاہ کے لحاظ سے تم سے کم تر ہوں اور ان لوگوں پر مت نظر ڈالو جو دنیوی لحاظ سے تم سے بڑھے ہوئے ہوں، اس لیے کہ اس سے تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔"

دوسرا حکم یہ ہے کہ ایک دوسرے پر حسد کرنے اور ایک دوسرے کے مال پر نظر رکھنے کی بجائے لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے فضل کی درخواست کریں۔ جو کچھ مانگنا ہے اسی سے مانگیں۔ اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات کسی اعتبار سے بھی لائق تحسین نہیں ہے کہ وہ یہ سوچیں کہ جو دوسرے کے پاس وہی اس سے چھن جائے اور ان کے ہاتھوں میں آجائے یہ ذہنیت ہی نفرت، بغض، عناد اور عداوت و کشمکش پیدا کرنے والی ہے۔ اس سے معاشرے میں فساد و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ چاہتا ہے کہ جس کسی کی بھی کوئی خواہشات و ضروریات ہوں وہ مثبت انداز میں اللہ تعالیٰ سے ان کی تکمیل کے جائز ذرائع کا سوال کرے۔ خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔[2]

ترجمہ: "کسی ایسی چیز کی تمنا مت کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے مردوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو وہ کمائیں، اور اللہ تعالیٰ ہی سے اس کے فضل کی درخواست کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

حضرت ابن عباس کے بقول اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ آرزو نہ کرے کہ کاش فلاں کا مال اور اولاد میرا ہوتا۔[3]

---

[1] کنز العمال: ۱۳۴/۱۶

[2] سورۃ النساء: ۳۲/۴

[3] تفسیر ابن کثیر: ۴۸۸/۱

ایک عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے کہ چاند کی فضیلت دوسرے تمام ستاروں پر (سنن ابوداود و ترمذی)

اسلام نے ایسے حریص اور لالچی انسانوں کو، جو مال و دولت کی طلب میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے سے حسد کرنے میں لگے ہوئے ہوں، سخت ناپسند کیا ہے ان کے مقابلے ایسے لوگوں کو قابل رشک قرار دیا ہے جو اللہ کی راہ میں ضرورتمندوں اور خیر و بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے کو اپنا وطیرہ بنائیں۔ ارشاد نبوی ہے۔

"قابل رشک تو دو آدمی ہیں ایک وہ مالدار جو اللہ کی راہ میں اپنا مال لٹاتا ہے اور دوسرا وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ کاش میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی اسی طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتا رہتا، پس اللہ کے نزدیک یہ دونوں اجر میں برابر ہیں"[1]

اس طرح اسلام مادہ پرستانہ مقاصد کے لیے باہمی مقابلہ و مسابقت کی بجائے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور خلق خدا کی خدمت و بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ جس کی بنا پر اہل ثروت اپنے مال و دولت کو لٹا کر آخرت میں زیادہ سے زیادہ اجر کے مستحق بن جاتے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی اجر سے محروم نہیں رہتے جو بہت زیادہ وسائل تو نہیں رکھتے لیکن یہ آرزو اور خواہش رکھتے ہیں کہ ان کے پاس بھی مال ہو تو وہ خدا کی راہ میں خرچ کریں۔

یہ مقدس اور اعلیٰ و ارفع جذبہ اس شعور سے پیدا ہوتا ہے کہ اصلی اور حقیقی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ وسائل حاصل کر لینا نہیں، کیونکہ یہ زندگی چند روزہ اور فانی ہے مرتے وقت آدمی کا سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے وہ خالی ہاتھ یہاں سے رخصت ہوتا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے وہ طالبان دنیا اور طالبان آخرت دونوں قسم کے لوگوں کو اپنے فضل و کرم سے رزق دیتا ہے یہ اب انسانوں کی مرضی ہے کہ وہ عارضی زندگی کو اپنی منزل قرار دیتے ہیں یا ہمیشہ کی زندگی کو، جس کی جو منزل ہوگی اسی کی طرف اس کا رُخ ہوگا۔ اسی کے لیے وہ زادِ راہ تیار کرے گا وہی اس کی تمام سرگرمیوں کا محور ہوگی، اس کے تمام انفرادی و اجتماعی رویے اسی کی روشنی میں تشکیل پائیں گے۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ مَنْ كَانَ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۴۸۶/۱

يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ[1]

ترجمہ: "اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھا دیتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسی دنیا ہی میں سے دے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔"

We Appreciate

The Islamic Cultural

& Educational Association

Bradford. U.K.

☆☆☆☆☆

A group of Young Muslims
Working for the sake of Islam

May Allah give you every Succcess.

(*From: Editorial Board Majallah Fiqh-e-Islami*)

[1] سورۃ الشوریٰ: ۲۰/۴۲

☆ الفقه حقيقته الفتح والشق ☆ فقہ کے معنی ہیں کھولنا اور بیان کرنا ☆